(خس وخاشاک زمانے)کانسائی مطالعہ

ڈاکٹر میمونہ سبحانی
ایسوسی ایٹ پروفیسر
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

Feminist Study of Khas-o-Khashak Zamany

Abstract

"Feminism's history is a tale of spirit, progress, and the tireless struggle for equality. It has inspired women and men globally to question norms, challenge systems, and envision a world where gender does not dictate one's path of success and priority. Feminism in literature explains how to understand women's experiences, society, and fairness between genders. The portrayal of women in Urdu fiction is an extensive topic, and it is difficult to explore it in a single research article. Therefore, this article only focuses on the writings of Mustansir Hussain's "Khas-o-Khashak Zamany". The stories depict feminine characters who suffer from different socio-culturally unscrupulous customs of society. He attempts to explain the male-oriented society and the dire situation of women who fell into the deception that someone would come to save them.

Keywords: Fiction, Women, Feminism, creativity, Mustansir

اردو ناول نے جہاں اب تک کئی طرح کے موضوعات اور رویوں کو اردو ادب کا موضوع بنانے کی کوشش کی وہاں تانیثیت اور فیمینزم کی آواز بھی مختلف کرداروں کے ذریعے بلند کرنے کی سعی بھی کرتا ہوا نظر آیا ہے۔ یہ کردار اپنے مکالموں کے ذریعے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی شعور کی آگاہ میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان فطری رویوں نے تانیثیت کے حوالے سے ابھرنے والی آوازوں کو بلند کیا اور یوں یہ نظریہ آہستہ آہستہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ اردو ادب میں یہ تحریک ترقی پسند تحریک سے ہوتی ہوئی آج تک موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ اس تحریک نے اس نقطے پر غور کیا کہ عورت مرد کی سطح پر آکر سوچے۔ تانیثیت ایک آئیڈیالوجی اور جدید فکری نظام سے وابستہ ہے جس کی وجہ سے عورتیں اپنی زندگی کے مسائل کو اپنے شعور اور زاویے سے پرکھنے لگیں۔ ہر دور میں خواتین نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنی نمائندگی کا احساس دلایا اور ہمت نہیں ہاری مستنصر حسین تارڑ نے بھی اس ناول کی کہانی میں عورت کی پسماندگی اور جہالت پر کڑی تنقید کی ہے۔

1973ء میں گجرات کے نواحی گاؤں میں پیدا ہونے والے مستنصر حسین تارڑ کو ناول نگاری اور سفر نامہ نگاری میں بہت زیادہ شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ آپ کے اب تک 12 سے زائد ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے کبھی ملازمت نہیں کی بلکہ اپنی تخلیقات کو ہی گزر بسر کا ذریعہ بنایا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی کی کفالت آپ نے اپنی تخلیقات کے ذریعے پوری کرنے کی کوشش کی۔ مدیحہ خالد لکھتی ہیں

"آپ نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز 1958ء میں ہفتہ وار رسالہ "قندیل" میں اپنے سفر نامے:لندن سے ماسکو تک" کی سلسلہ وار اشاعت سے کیا۔اس کے بعد آپ کی تحریروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور ان کا پہلا سفر نامہ 1971ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا جس کا نام "نکلے تیری تلاش میں" ہے۔اس سفر نامے کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی اور یہیں سے جدید سفر نامہ نگاری کی بنیاد پڑی۔(1)

مستنصر حسین تارڑ نے ہر صنف میں اپنی صلاحیت کو منوایا۔سفر نامہ نگاری کے ساتھ ساتھ آپ کو ناول نگاری کے فن میں بھی شہرت حاصل ہوئی۔مستنصر حسین تارڑ کو بنیادی طور پر ناول پسند ہے۔ان کے خیال میں ناول لکھنے میں چیلنج ہوتا ہے۔ناول میں آپ کرداروں کو آزاد کرتے ہیں ان کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔اس کے برعکس سفر نامے میں جو دیکھتے ہیں بس اس کو ہی لکھا جاتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناولوں میں تاریخ،جغرافیہ،تہذیب،ناسٹیلجیا،وقت کی اہمیت کی بہت خوبی کے ساتھ اپنے ناولوں کا حصہ بنایا ہے۔ماضی،حال اور مستقبل تینوں زمانوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ اپنے تخلیقی عمل پر توجہ دیتے ہیں۔ڈاکٹر فضیلت بانو لکھتی ہیں

"ان کے ادبی تصورات اور رجحانات کی بنیاد انسان دوستی اور روشن خیالی ہے۔(2)

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "خس و خاشاک زمانے "2010ء میں منظر عام پر آیا۔یہ ناول 740 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کا انتساب "عطار کے پرندوں اور آدم کے نام" کے نام ہے۔اس ناول میں وقت کے تصور کو مد نظر رکھا گیا ہے۔تین نسلوں کے عروج وزوال،شکست وریخت،معاشرت اور تہذیب وثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔اس ناول کی کہانی 1930ء سے لے کر موجودہ عہد تک کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔یہ ناول تقسیم پاکستان کا خصوصی۔۔۔۔۔اظہار ہے،یہ ناول ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس میں چھوٹے بڑے کم از کم 76 کردار ہیں۔کوئی کردار ایسا نہیں ہے جو کہانی میں غیر ضروری ہو۔تاریخ کے موضوع پر تو ویسے ہمارے ہاں "آگ کا دریا"(قراۃ العین حیدر)"اداس نسلیں"(عبداللہ حسین)"آنگن"(خدیجہ مستور)"گریز"(عزیز احمد)"راجہ گدھ"(بانو قدسیہ)"غلام باغ"(مرزا اطہر بیگ)اور "کئی چاند تھے سر آسمان" بھی موجود ہیں۔لیکن جو تکنیکس اس ناول میں خاص کر بیانیہ تکنیک کا ثانی کوئی دوسرا ناول نہیں ہو سکا۔منشایاد اس حوالے سے رقم طراز ہیں

"اسے کسی ایک جگہ یا ملک اور زمانے تک محدود نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں کئی زمانے اور برصغیر پاک وہند اور دنیا کے بہت سے اہم واقعات و سانحات اور تاریخی حوالے ملتے ہیں۔(3)

اس ناول کے نسوانی کردار بھی مستنصر حسین تارڑ کے باقی ناولوں کی طرح حوصلہ افزا اور باہمت ہیں۔جس طرح عورت کے بغیر معاشرے کی تکمیل نہیں ہو سکتی اسی طرح اردو ادب بھی نسوانیت کے بغیر ادھورا ہے۔مستنصر کے ناول لکھنے کا اسلوب بہت شاندار ہے۔آپ اپنے نسوانی کرداروں کے ذریعے عورت کے متنوع پیکر اور تصورات کو سامنے لے کر آتے ہیں۔اس لیے اسے تخلیقی عمل میں لانے کے لیے عورت کی حقیقت کو جاننا بہت ضروری ہے۔جیسے قدیم تہذیبوں کا مطالعہ،مختلف ادوار اور تہذیت و تمدن میں عورت کے کردار کا گہرائی سے مشاہدہ تخلیق کار کی تخلیق میں رنگ بھر دیتا ہے۔یوں عورت کے جذبات،احساسات،کردار،اعمال و افعال بتدریج آشکار ہوتے ہیں اور وہ اپنی شخصیت کے مختلف رنگوں سمیت عیاں ہو جاتی ہے۔مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں عورت ہمیشہ مرکزی کردار کے طور پر رہی ہے۔اس لیے ان کے نسوانی کردار خاص اہمیت کے حامل ہیں مستنصر خود لکھتے ہیں

"میرے ناولوں میں بیشتر کردار جو زیادہ قوت کے ساتھ ابھرے اور نمایاں ہوئے اور جن کا تذکرہ ہوا وہ عورتوں کے ہیں۔(4)

مستنصر حسین تارڑ کے ویسے تو ہر ناول میں عورتوں کے کردار جان دار ہیں مگر خس و خاشاک زمانے کے نسوانی کردار نہایت عمدگی سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔اس ناول میں تصور حیات اور تصور انسانی کی تین نسلوں کی کہانی کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔انسان آبائی جبلت کے دائرے سے کبھی نکل نہیں سکتا۔شباہت کا کردار بھی اسی طرح کا کردار ہے اور یہ اس ناول میں بنیادی کردار بھی ہے جو کسی عقیدے کی پرواہ نہیں کرتی لیکن انسانیت کی ترجمان ضرور ہے۔اس کی پیدائش کے فوراً بعد ہی اس کی ماں جوتی سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔جوتی شباہت کا باپ ہے۔اس کی تربیت اس کے باپ نے نہیں بلکہ اس کی ماں نے کی۔لیکن اسے اپنے خاندان کی خبر تب ہوتی ہے جب وہ اپنے دادا سے ملتی ہے۔

"پتر تو بے شک مجھ میں ہے، میرا بیج ہے۔۔۔۔ مردار گوشت کی البیلی چاہت مجھے بے حال کرتی تھی پتری آنکھوں میں بھی وہی سانسی پن ہے تو مجھ میں سے ہے چھوڑئے !شباہت اس کی الفت شکنجے میں کسی، مامبوہت اسے تکتی تھی کیا یہ میری جڑیں ہیں۔ میرے وجود کا بوٹا مردار گوشت کی چاہت میں پھوٹا تھا۔۔۔۔ میں ایک سانسن ہوں۔"(5)

شباہت کے دادا کو اسے اپنے خطے کی قدیم ترین تہذیب کے نمائندہ کردار کے طور پر پیش کیا گیا۔ جو قدیم قبائلی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے وہ سانسی قبیلہ ہے۔ جو جرائم پیشہ ہیں۔ یہ لوگ راجپوت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن کہانیوں کے مطابق ان کے آباؤاجداد کا تعلق بیڑیا(Beriya) قبیلے سے ہے یہ بھی جرائم پیشہ قبیلہ مشہور رہا۔(6)ان کی زندگی کا انحصار گائے کی چوری اور مختلف چھوٹے جرائم پر تھا۔1871ء،1911ء اور 1924 ء کے مجرمانہ قبائل ایکٹ مطابق یہ دونوں قبائل ہی جرائم پیشہ قرار دیے گیا تھا۔ ان لوگوں کا کوئی مذہب نہیں اور نہ ہی حلال و حرام میں تمیز باقی ہیں۔ جو غیر جاندار آزاد، بے تعصب اور زمین سے جڑی ہوئی پر امن تاریخ کا امین ہے۔ جب شباہت اپنے دادا سے ملتی ہے تو جاتے وقت دادا پیار سے اس کے گالوں پر بوسہ دیتا ہے۔ گویا یہ سروسانسی خاندان کے منہ پر آخری بوسہ تھا جو اپنی جبلت اور زمین سے جڑے رہنے کی علامت تھا۔ شباہت کے ذریعے مصنف نے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ آزادی کسی بھی تعصب سے پاک ہونے کا نام ہے۔ ایسی آزادی جو کسی مذہبی یا سیاسی تنگ نظری سے دور ہو۔ شباہت جب اپنے دادا سے کہتی ہے کہ وہ کینڈا چلے تو دادا اپنی تہذیب کی نمائندگی ان جملوں سے کرتا ہے۔

"مجھے کسی اجنبی چنار تلے دفن نہیں ہونا مجھے اپنے کیکر کا ایک کتبہ درکار ہے جس میں زرد پھول پھوٹتے رہیں اور ان کی مہک قبر کے اندر مجھ تک پہنچتی رہے۔"(7)

شباہت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو سونگھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ ہر چیز سے بالاتر ہو کر انعام سے محبت کرتی ہے انعام سے وہ کہتی ہے

"اس دھرتی میں جتنے بھی آدم کے مٹی کے بت ہیں ان کی مٹی کو پھر سے گوندھ کر ایک نئے انسان کو ایک نئے آدم کو تخلیق کرنا ہے اسے ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور خیال کرنا ہے کہ اس مٹی میں کوئی ایک ذرہ بھی بے انصافی، ستم اور غربت کا نہ ہو۔ اس میں مذہبی معاشرتی اور نسلی تنگ نظری کا شائبہ تک نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور تم ان میں سے ایک ہو سکتے ہو اگر تم چاہو۔"(8)

انعام اپنا وعدہ پورا کرتا ہے اور انعام کو وہ ایسی تہذیب کا قائم مقام بنا دیتی ہے۔ انعام کا کردار اس ناول کے اہم کرداروں میں شمار ہوتا ہے۔ جسے سروسانسی مختلف دلائل سے اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ناول نگار نے اس ناول کے ایک اور عمومی کردار سوہنی سانسن جو شباہت کی دادی کی صورت میں دیکھایا ہے۔ جو اس جنگلی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ شباہت اور انعام کی شادی نے ڈیڑھ سو برس کی معدوم ہوتی ہوئی تہذیب کی اس عورت کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ شباہت کا نام بھی مصنف نے شاید اسی صورت حال کے پیش نظر رکھا ہے۔ جو جبلت کے سامنے بے بس ہے۔ جبلت ایک فلسفیانہ نظریہ ہے اس قسم کے خیالات، اصول پیدائش کے وقت سے ہی انسان کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ خیالات کبھی کبھی تو مکمل صورت میں موجود ہوتے ہیں اور کبھی ان خیالات کو پورا کرنے کے لیے مختلف تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ "ڈیکارٹ" اس نظریے کا پیش رو تھا۔ انگریز فلاسفر "لاک" اس نظریے کا مخالف تھا۔(9) اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بھی وہ اپنی سروسانسی کیفیت کو بدل نہ سکی حیوانی جبلت کے آگے وہ کچھ نہ کر سکی ایسے لوگ کبھی سماج کا حصہ نہیں بن پاتے۔ ان کا خاندان، قوم اور برادری سب کچھ اس زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے جانور ہوتے ہیں جو ان کی خوراک کا حصہ بنتے ہیں۔ سروسانی بھی مردار کھانے والے ایسے ہی سماج کا حصہ ہے جو ناول میں بنیادی کردار ادا کر رہا ہے تاہم اپنے ماضی سے متعلق اس کا تعلق بہت گہرا رہا۔

اس ناول کا ایک اور اہم کردار "ماہلو" ہے جس کا اصل نام صغریٰ بی بی تھا مگر وہ اپنے حسن کی بنا پر "ماہلو" کہلائی۔

"وہ اس نسل کی ماہلو تھی جو کبھی بھاگ والی نہیں ہوتی پر وہ جہاں سے بھی گزرتی تو اپنے پیچھے نور کی ایک کہکشاں چھوڑ جاتی تھی۔"(10)

ماہلو کی شادی کوٹ مراد کے چوہدری سے ہوئی لیکن اس کے بدمعاش چچا کے ڈر کی وجہ سے بہت دھوم دھام سے نہ ہو سکی۔ ماہلو کے "کوٹ مراد" میں آنے کے بعد آنے والی برکات کا ذکر مصنف نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"اس برس گندم کے خوشوں میں دانے دگنے ہوگئے، بھینسوں کے تھن دودھ سے اتنے بوجھل ہو گئے کہ وہ چل نہ سکتی تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ان کی بیاہ کی دھوم ایسی پڑی تھی۔"(11)

ماہلو جب رخصت ہو کر اپنے سسرال آگئی تو بہت اداس تھی۔شادی کی رات اس نے اپنے شوہر سے فرمائش کی کہ ہر چڑھتے مہینے میں پہلی جمعرات کو مجھے اپنے "چاچے "اور "بے بے" سے ملنے کے لیے دنیاپور جانے دیا کرنا۔ سواس کے شوہر نے اس کی یہ خواہش پوری کی۔ماہلو کو اس ناول میں خوش بختی کی علامت دکھایا گیاہے جو جہاں جاتی ہے سکھ بکھیر دیتی ہے۔

ماہلو کا چچا بخت جہاں عیش و عشرت کا شوقین تھا۔طوائفیں جب خاص طور پر 'دلاری بائی"جٹا ای اوئے"کا نعرہ لگاتی تو تمام جاٹ اپنا سب کچھ طوائف کے قدموں میں ڈال دیتے۔دلاری بائی اپنے رقص وموسیقی کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔رقص کے دوران وہ اپنے پاؤں کو "پچھل پیری" سے ہلاتی ہے۔جس سے اس کے رقص کی نفاست اور خوب صورتی کا پتہ چلتا ہے۔اس رقص اور خوبصورت اداؤں کی وجہ سے وہ اپنے تماش بینوں پر قیامت ڈھاتی ہے۔وہ اپنی بے خودی اور مستی کے اس مقام پر لے آتی ہے جہاں تماش بین اس پر دولت لٹانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

"جب دلاری بائی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بھٹ رناں دی یاری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کے بعد جٹاای روئے کی صدا بلند کی اور رام پیارے طبلے کی تھاپ پر سر دھڑ کی بازی لگادی اور بخت جہاں کے صحن میں براجمان جیتے بھی جاٹ تھے وہ بے خود ہو گئے۔"(12)

اس ناول میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جاگیرداروں، سرداروں اور وڈیروں پر کس طرح زوال آتے ہیں۔"دلاری بائی "جیسی عورتیں کس طرح ان سے زمینیں اور جائیدادیں لے لیتی ہیں۔یہ لوگ شراب کے نشے میں مست ہو کر اپنی تمام ناانصافیوں کا اعتراف تو کرتے ہیں مگر اس کو چھوڑتے نہیں ہیں نتیجتاًزوال اس کی علامت بن جاتا ہے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ گاؤں کے وڈیرے جاگیردار زبردستی مزارعوں کی بیٹیوں بہنوں اور بیویوں کو ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اور کچھ گاؤں کی عورتیں غربت سے مجبور ہو کر پیسے کی لالچ میں وڈیروں کی رکھیل بن جاتی ہیں۔لیکن جب کسی اور کو ان کے بارے میں پتہ چلتا ہے تو پھر ان کے راز فاش ہو جاتے ہیں،کچھ لوگ ان کو بلیک میل کرتے اور پھر ان سے بھی اسی جنسی تعلق کی فرمائش کی جاتی ہے جو وڈیروں کے ساتھ ان کا قائم ہوتا ہے۔"چھیمو" بھی ایسا ہی نسوانی کردار ہے جسے ہوس پوری کرنے اور شادی کرنے کے بعد ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔اور جسے ہمارے سماجی رویوں کی صورت میں پیش کیا گیاہے۔

"آخر اچھے بھلے شرفاء چودھری، قریشی، گیلانی اور سید بادشاہ بازاری، طوائفوں اور رنڈیوں سے شادی کیوں کر لیتے ہیں۔ایسی عورتوں میں لذت کی کوئی ایسی رمز ہوتی ہے کوئی کارکردگی ایسی ہوتی ہے کہ مرد اسے اپنے گھر میں ڈال لیتا ہے۔"(13)

اس ناول میں مستنصر حسین تارڑ نے ایسے جابرانہ نظام پر تنقید کی ہے جس کا تعلق وڈیروں سے ہے۔وڈیرہ ازم کا شکار خواتین کس طرح مجبوری کی زندگی بسر کرتی ہیں اور کس طرح بغاوت کرنے سے پہلے ہی ان کی رسیاں کھینچ دی جاتی ہیں۔یہی وڈیرہ شاہی نظام معاشرے میں بگاڑ اور منفی اثرات کا ضامن ہے۔اس معاشرے کے لوگوں کے لیے مستنصر کی یہ آواز نہ صرف قابل فہم ہے بلکہ قابل غور بھی ہے کہ بے رحم وقت کے ہاتھوں انسان کبھی بند نہیں باندھ سکا اور یہ بے رحمی انسانوں کا اچھا مقدر تباہ کر دیتی ہے۔تین نسلوں کی کہانی، داستان اور تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ کو مصنف نے کرداروں کے سہارے بڑی مہارت سے بیان کیا ہے یہی وجہ ہے کہ گلوبلائزیشن کے اس دور میں بھی مستنصر کا شمار اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1. مدیحہ خالد، مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں کے نسوانی کردار، غیر مطبوعہ مقالہ فیصل آباد، جی سی یونیورسٹی، سیشن 2007 تا 2009، ص4
2. فضیلت بانو، سفر نامے مستنصر حسین تارڑ، عطا الحق قاسمی اور انتظار حسین (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل فیصل آباد، جی سی یونیورسٹی سیشن 2006ء تا 2008ء، ص40
3. منشا یاد، خس و خاشاک زمانے مشمولہ، ماہنامہ الحمرا، مدیر شاہد علی خان، لاہور: نومبر 2010، ص42
4. قرۃ العین طاہرہ، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ سے مکالمہ، تسطیر، لاہور: اکتوبر 2003، ص78
5. مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2010ء، ص118-119
6. Elizabeth Prine ,Sansi, https://www.britannica.com/topic/Sansi,2012, Accessed on 30 August 2023.
7. خس و خاشاک زمانے، ص562
8. ایضاً، ص121-122
9. ویکیپیڈیا، جبلت، Accessed on 28 August 2023 https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%AC%D8%A8%D9%84%DB%8C%D8%AA,
10. خس و خاشاک زمانے، ص66
11. ایضاً، ص66
12. ایضاً، ص96
13. ایضاً، ص79